

صَكَفْ

تَكَام

رِيَاءُ  
رِيَاءُ



عَلَى الدِّينِ نَوِيدُ

## جملہ حقوق بحق ”جمشید عرف“ محفوظ

- طبع : اوّل
- تعداد : ایک ہزار
- سنہ طباعت : دسمبر ۱۹۶۹ء
- قیمت : چار روپے
- سرورق : تین : اعظم راہی ، سلام خوشنویس
- کتابت : محمود سلیم
- طباعت : جے رام پرنٹرس چھتہ بازار حیدرآباد
- بلاکس : ڈالٹن پریس حیدرآباد
- ناشر : حیدرآباد لٹری فوڈم (حلف)
- زیر اہتمام : ادارہ پبلیک حیدرآباد

معادنت : اردو اکیڈمی، آندھرا پردیش، حیدرآباد  
ایچ۔ ای۔ ایچ دی نظامس اردو ٹرسٹ

ملنے کے پتے:

- اردو اکیڈمی آندھرا پردیش، اے سی گارڈز حیدرآباد
- الیاس ٹریڈرس۔ شاہ علی بندہ حیدرآباد
- مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی۔ بمبئی۔ علی گڑھ
- شب خون کتاب گھر، 313 رانی منڈی الہ آباد۔ 3
- مصنف - 351-3-16 چنچل گڑھ حیدرآباد۔ 500024
- موجودہ پتہ :- 4/15-3-6 (چنچل گڑھ حیدرآباد)
- فون 244144-43

وَاللّٰهُ حُسْبِيَ مَا كُنْتُ نَذِرُ



خُوش مُسَبِّحُ

آوانر

اور

رنگ کے نام



ریگزاروں ہی سے پیاس اپنی بجھانی ہے نوید  
جی میں آتا ہے کہ اب دشت کو دریا لکھیں



## ترتیب

ذات سے کائنات تک“ ۹

غزلیں ۱۹۶۵ء تا ۱۹۷۹ء

آنکھوں کے کنول لب کے چمن زار بہت تھے ۱۳

کچھ ایسے صاحبِ کردار بن گئے ہم لوگ ۱۴

لمحوں کو سولیوں پہ چڑھاتا ہوں رات بھر ۱۶

ٹوٹے گی کسی دن تو کٹھن رات کی دیوار ۱۷

لب کی بیمار، مدھم روشنی ہے زندگی ۱۸

سحر کے ہاتھ میں بھی تیرگی کا کاسہ ہے ۲۰

دراز اور کہانی کا سلسلہ نہ کرو ۲۱

ہر صبح میں پتھر کی طرح سخت بنا ہوں ۲۲

راتیں علیل، صبح کا چہرہ بچھا ہوا ۲۳

اپنے سائے ہی کا قد ناپ کے اکثر ہم لوگ ۲۵

احساس دیکھ پائے وہ منظر تلاش کر ۲۷

دن کا قاتل ہوں میں، سولی پہ چڑھا دو مجھ کو ۲۹

- آنکھوں میں زرد خواب کا جب تک لہو رہے ۳۰  
 سناٹوں کے لب صدیوں سے چوم رہا ہوں ۳۱  
 ادنیٰ عمارتوں میں اُجالا تھا بلب کا ۳۳  
 کچھ یوں ہوا وہ دور کہ نزدیک آگیا ۳۴  
 ایک آواز کہ جانی ہے نہ پہچانی ہے ۳۶  
 کب ہم سے یونہی درد کا بار گرا اٹھا ۳۷  
 دل، سلگتا ہے سرشام، سب ایندھن کی طرح ۳۸  
 تیرے ہی پاس رہ کے تجھے بھول جاؤں گا ۳۹  
 کبھی کبھی تو کچھ ایسا دکھائی دیتا ہے ۴۰  
 میرا "میں" مجھ سے خفا ہے کے بلا آخر شب ۴۱  
 اک اسی جھوٹ میں پوشیدہ ہے سچائی بہت ۴۲  
 جب پھلکتے ہیں تمناؤں کے ساغر دھوپ میں ۴۳  
 تری گرفت میں آئے نہ خود نہ بس میں رہے ۴۵  
 جب دل میں تیری یاد کا غم سکرائے ہے ۴۶  
 نہ طرزِ دوست نہ رنگِ عدو سے ملتا ہے ۴۷  
 برسوں تری آواز کے لب چوم چکا ہے ۴۸  
 اک زمانے تک تو بس ایسا ہوا ۵۰  
 جوانِ لیس کا ذائقہ بن گیا تھا ۵۲  
 جب بھی آدھی رات کو ہم گھر گئے ۵۳  
 فن ہے نازک بہت، بُت گری کی طرح ۵۴  
 تمار شب کا، سحر دم رہا ہے آنکھوں میں ۵۶  
 غم میں لذت ہے نہ زخموں میں ہنسی باقی ہے ۵۷

ہاں، یہ بھی سچ نہیں کہ اداکار ہم نہیں ۵۸  
 چوٹ لگنے پر بھی ہنسنے کی ادا کیسی ہے ۶۰  
 یہ کیسی فصل آنکھ میں برونے لگے ہیں ہم ۶۱  
 کیا جانے کب آخر شب، آئینے ٹوٹے ۶۲  
 صحران کی خشک ریت تھمے، ہر سو بکھر گئے ۶۳  
 یہ زمین جب سے سوالی ہو گئی ۶۵  
 نظم ہو یا کہ غزل، جب کبھی تازہ لکھیں ۶۷  
 متفرق اشعار ۶۹ تا ۷۶

نظمیں ۱۹۶۰ء تا ۱۹۶۷ء

ندائے نود ۷۹  
 گرجتے ابابیل ۸۱  
 عکسِ خوں ناپ ۸۳  
 زندگی ۸۵  
 تشلیٹ کی پیاس ۸۶  
 اکیسویں صدی ۸۸  
 آئینوں کا سفر ۸۹  
 نارسائی ۹۰  
 تھے سورج کی انگڑائی ۹۱  
 میں لمبی نیند لینا چاہتا ہوں ۹۳  
 تیسری آنکھ کی بے بسی ۹۵

## تخلیق ۹۷

وہ غواص اب ایک سمندر بنا ہے ۹۸

درد کی موت ۱۰۰

میرا آئینہ ہے وہ آئینہ ۱۰۱

سحر سحر اب ہے ۱۰۲

انحطاط ۱۰۳

ایک نیا سورج اُگے گا ۱۰۵

صدف تمام ریت ریت ۱۰۷

بازگشت : ڈاکٹر مغنی تبسم ۱۱۰



## ”ذات سے کاٹنا تک“

میر سی زندگی ”تیز و تند ہواؤں میں جلتا ہوا اک چراغ ہے۔ روزِ اول ہی سے تشنگی میرے حقے میں آئی۔ پولیس ایکشن (POLICE ACTION) کے دوران جبر و استبداد کے سفاک ہاتھوں، میرے والد، چچاؤں اور دیگر افراد خاندان کا بیدار نہ قتل، جسے میرے بچپن کی آنکھ نے دیکھا تھا، آج بھی میرے لاشعور میں کسی زخمی پرندے کی طرح پھڑپھڑاتا ہے۔ بڑے بھائی اور چچا کی شفقت آمیز پرورش، تعلیم و تربیت اور ماں کی دعاؤں ہی کا فیض ہے کہ میں نے طوفانوں کی گود میں پلنے کا فن سیکھا، ہمناباد (جید آباد رنگ)، کفایت کھیتوں، کھلیا نوں، پگڈنڈیوں اور کیار یوں کے آس پاس میرے شعور نے آنکھ کھولی۔ شہرِ دکن کی شاداب ادبی فضا میں زمینِ دیدہ و دل سے فکرِ سخن کی کوئیل پھوٹی۔ شاعری مجھے ورثے میں ملی ہے۔ میر محترم ماموں صلاح الدین نشتر کا شمار حیدرآباد کے ممتاز شعرا میں ہوتا ہے۔ حیدرآباد کی ادبی فضا سے پہلی بار میں ان ہی کی بدولت متعارف ہوا جن کے حسنِ سلوک اور مشفقانہ برتاؤ سے مجھے اک حوصلہ ملتا رہا ہے۔

ٹوٹنے، بننے کا عمل مجھ میں برسوں رہا ہے۔ صبح سے گھر وندے بنانا اور شام ہوتے ہی انہیں ڈھکا دینا۔ چڑھتے ہوئے سورج کی طرف پہرہ دوں دیکھنا مسیرا محبوب مشغلہ رہا ہے۔ لہراتے رنگوں، رس بھری آوازوں اور ریشمی سایوں کی توسِ قرح کا میرے اندر کے انسان نے برسوں پیچھا کیا ہے۔ جو آج صبحا کی گرم ریت بن کر میری رگوں میں خون کی طرح رواں دواں ہے۔

”صدف تمام ریت ریت“ میرا پہلا شعری مجموعہ، ذات سے کائنات تک میرے پندرہ سالہ ذہنی سفر کا آئینہ دار ہے۔ خود بینی اور کائنات شناسی کی اپنے تئیں اس سچی پیہم میں میری فکر نے جو علاماتی اور استعاراتی تلنے بانے بئے ہیں اس کا اظہار میری شاعری ہے۔ شاعری میرے نزدیک نہ تو صناعی ہے اور نہ ہی تبلیغ، تحریک یا ادارے کا پلیٹ فارم۔ میرے احساس کی آنکھ کسی مخصوص عینک کی تابع نہیں۔ گرد و پیش کے واقعات کا کسی فن کار کے لاشعور میں جذب ہو جانا اتنا ہی فطری عمل ہے جتنا کہ کسی متحرک کیمرے کا اپنے احاطے میں آئے ہوئے ہر منظر کو اپنی گرفت میں لے لینا۔ اور تخلیقی عمل — مبری دانست میں شعور و لاشعور کے درمیان سانس لیتی ہوئی اُس سوچ کا نام ہے جو کسی نامعلوم لمحے میں زبان — طرز، آہنگ اور اسلوب میں ڈھل جاتی ہے۔

معاشرے کا کرب و انتشار، ٹوٹتے، بکھرتے، بنتے، بگڑتے لمحوں کی رفاقت، اقدار کی زوال پذیری، ارتقاء کے نام پر تہذیب کی بربریت اور ایسے ہی کئی محرکات میرے اندر اک جذر و مک کی سی کیفیت پیدا کر دیتے ہیں جو بلبلوں کی مانند میرے لاشعور سے شعر کی صورت ابھر آتے ہیں۔

ڈاکٹر مغنی تبسم کا میری شاعری پر ”تجزیاتی جائزہ“ — ”بازگشت“ — اس کتاب کے آخر میں شامل ہے۔ میں ان کا شکریہ گزار ہوں کہ باوجود ناسازی مزاج، انھوں نے یہ سیر حاصل مضمون لکھا۔

مکرمی سلام خوشنویس، اعظم راہی اور محمود سلیم کے تعاون کے بغیر اس مجموعے کی صورت گری بروقت ممکن نہ تھی جس کے لئے میں ان کا بھی شکریہ گزار ہوں۔

علی الدین نوید

حیدرآباد

۲۷ دسمبر ۱۹۷۹ء



غزلیں

۱۹۶۵ء تا ۱۹۷۹ء



ہم تو جدت کے بھی قائل ہیں مگر کیا کیجے  
ہم سے ممکن ہی نہیں دُھوپ کو سایہ لکھیں





آنکھوں کے کنوئلب کے چمن زار بہت تھے  
دیوانے مگر سیر سے بنزار بہت تھے

ہم لوگ کڑی دھوپ کے شیدائی تھے، درنہ  
یوں سر کو چھپانے در و دیوار بہت تھے

ہر شخص کے چہرے پہ کئی چہرے تھے چہیاں  
تجھ جیسے ترے شہر میں غیار بہت تھے

ٹوٹا ہوا پیل، ریت کی دیوار، ہوا تیز!  
لگتا ہے کہ بستی میں گنہ گار بہت تھے

الفاظ ادا کرتی رہیں بولتی آنکھیں  
چپ رہ کے بھی وہ مائلِ گفتار بہت تھے

آنکھوں کے دریچوں میں حیا جاگ رہی تھی  
سوئے تھے کچھ ایسے کہ وہ بیدار بہت تھے

وہ شخص تو ہر گام پہ دیتا رہا دھوکے  
تم پھر بھی نوید اُس کے پرستار بہت تھے



کچھ ایسے صاحبِ کردار بن گئے ہم لوگ  
جہاں بھی چاہا اداکار بن گئے ہم لوگ

کشاکشِ دلِ بیمار بن گئے ہم لوگ  
شکستہ ناؤ کی پتوار بن گئے ہم لوگ

ہر ایک شخص ہمیں حرفِ حرف پڑھتا ہے  
کبھی کتاب تھے، اخبار بن گئے ہم لوگ

بدن میں دھوپ کا آسیب سانس لیتا ہے  
صدی کے قہر کا معیار بن گئے ہم لوگ

چلے تو دشت و بیاباں کا قہر تھا ہم میں  
رُکے تو سایہ دیوار بن گئے ہم لوگ

خوشیوں کے الاؤ میں رات بھر جل کر  
بجھے تو شعلہ اظہار بن گئے ہم لوگ

ہماری ذات تو ویسے بھی اک معتمہ ہے  
کھلے تو اور پُر اسرار بن گئے ہم لوگ

سحر کی راہ میں آنکھیں بچھا رہے تھے نوید  
سحر جو آئی، شبِ تار بن گئے ہم لوگ



لمحوں کو سُولیوں پہ چڑھاتا ہوں رات بھر  
آبِ رواں پہ نقش بناتا ہوں رات بھر

سُورج کے غم میں اشک بہاتا ہوں رات بھر  
مرحوم دن کا سوگ مناتا ہوں رات بھر

کاغذ کی ایک ناؤ بناتا ہوں شام تک  
کالے سمندروں میں چلاتا ہوں رات بھر

جیسے خدا زمیں پہ نہیں آسمان پہ ہے  
کچھ یوں دُعا کو ہاتھ اٹھاتا ہوں رات بھر

تنہائیوں کی جھیل کے پہلو میں بیٹھ کر  
زخموں کی چاندنی میں نہاتا ہوں رات بھر





ٹوٹے گی کسی دن تو کٹھن رات کی دیوار  
ہوگا اسی دیوار سے خورشید نمودار

اک شخص مرے ساتھ رہا کرتا ہے اکثر  
مُجرم کی طرح جس کا ہے سہا ہوا کردار

میں خار کے دامن سے لپٹا ہوا سایہ  
تو پھول کی نس نس سے نکلتی ہوئی مہکار

کیا شہر سے دیوانہ کوئی روٹھ گیا ہے؟  
سنان سے لگتے ہیں گلی کوچہ و بازار

تپتی ہوئی سانسوں کو خنک چھاؤں میں لیکر  
سورج کی تمازت میں جھلستے رہے اشجار



بَلْب کی بیمار، مدھم روشنی ہے زندگی  
نیم شب، مرگھٹ کی مردہ خامشی ہے زندگی

ظلمتوں میں نور کی پیغمبری ہے زندگی  
موت کا عرفان ہے خود آگہی ہے زندگی

قطرہ قطرہ دل کی رگ رگ سے ٹپکتا ہے لہو  
لمحہ لمحہ جسم و جاں سے رس رہی ہے زندگی

ہم اسے سورج کے آئینے میں کیوں مگڑھو نہاتے  
شب کی اندھی وادیوں میں کھو گئی ہے زندگی

کتنی صدیوں سے شکستہ مقبروں کے آس پاس  
شب کے ستارے میں اکثر چمکتی ہے زندگی

سرد، خستہ، مضمحل، مدقوق اور کاسہ بہ دست  
ہر طرف فٹ پاتھ پر بکھری پڑی ہے زندگی

اونچی اونچی بلڈنگوں کی آہنی آغوش میں  
زرد مٹی کے گھروندے ڈھارہی ہے زندگی

دھوپ کا کٹہ وا کسیرا زہری کہ بھی نوید  
بوڑھے برگد کی گھنی چھایا بنی ہے زندگی



سحر کے ہاتھ میں بھی تیرگی کا کاسہ سر ہے  
نئے سورج سے کیا مانگیں، نیا سورج گداگر ہے

میں ٹوٹا آئینہ ہوں مجھ پہ پتھر پھینکتے کیوں ہو  
تمہاری شخصیت تو دوستو! یوں بھی قد آور ہے

ہوس ہر سمت ننگی ناچتی پھرتی ہے سڑکوں پر  
سمندر پار مت دیکھو بڑا مکروہ منظر ہے

جہاں تم ہو وہاں یہ بادلوں کا سائیاں ہوگا  
مرے سر پہ تو لوگو! دھوپ کا خوں ناب لشکر ہے

پگھلتی ساعتوں کے آئینے میں خود کو کیا ڈھونڈیں  
پگھلتی ساعتوں کا آئینہ سیال منظر ہے



درازا اور کہانی کا سلسلہ نہ کرو  
بس ایک موڑ پہ رُک جاؤ پھر ملانہ کرو

مرے لہو سے جو مقتل کی پیاس بجھتی ہے  
خوشی سے جانبِ مقتل مجھے روانہ کرو

تکلفات کی دیوار کچھ تو رہنے دو  
خود اپنے سائے سے کھل کر کبھی ملانہ کرو

بدن جھلستا ہے پاگل ہوا کے جھونکوں سے  
خیال و خواب کے زخمی کواڑ وا نہ کرو

قدم قدم پہ اندھیروں کا سامنا ہے نوید  
اگر ہے خوف ہوا کا تو پھر جلا نہ کرو



ہر صبح میں پتھر کی طرح سخت بنا ہوں  
شام آتے ہی شیشے کی طرح ٹوٹ گیا ہوں

گرتی ہوئی دیوار کے سائے میں ٹھہر کر  
چمڑھتے ہوئے سورج کی طرف دیکھ رہا ہوں

اک بار کسی نے مجھے دیوانہ کہا تھا  
اب تک اُسی لہجے کی ادا ڈھونڈ رہا ہوں

تم صبح کے ایوان میں شاداب کھڑی ہو  
میں رات کی دلدل میں اُترتا ہی چلا ہوں

میں اب بھی تیری ریشمی پلکوں کی زمیں پر  
سیال نیگیوں کی چمک بن کے کھڑا ہوں

## نذرِ خورشید احمد جامی

راتیں علیل، صبح کا چہرہ بُجھا ہوا  
اس دور کا بدن ہے لہو تھکاتا ہوا

وہ سامنے کھڑا تھا مرے بُت بنا ہوا  
اُس کا تمام جسم لگا بولتا ہوا

دیکھا تو دُور تک تھا اندھیلوں کا سلسلہ  
سوچا تو سامنے ہی تھا سورج کھڑا ہوا

اس کے بدن کی چٹخ بڑی دلخراش تھی  
میرا وجود آج بھی ہے کانپتا ۛ

وہ شخص چھینٹا ہی رہا زخم زخم زخم!  
مقتل میں زور دار مگر قہقہہ ہوا

ہر جسم پیلی دھوپ میں تحلیل تھا مگر  
سڑکوں پہ سایہ سایہ ملا رہی نگتا ہوا

پلکوں کے سائبان میں ہر اشک سو گیا  
جب سے ہے تیرے غم کا تنفس رکا ہوا

کرنیں نکل رہی ہیں ہر اک حرف سے نوید  
”دل کے ورق پہ نام ہے کس کا لکھا ہوا“

\* یہاں میں نے ”قہقہہ اٹھا“ کے بجائے ”قہقہہ ہوا“ استعمال کیا ہے





اپنے سائے ہی کا قدناپ کے اکثر ہم لوگ  
جان جاتے ہیں کہ ہیں کتنے قد آور ہم لوگ

یوں چھبھو دیتے ہیں احساس میں نشتر ہم لوگ  
دل کو رکھ دیتے ہیں زخموں میں ڈبو کر ہم لوگ

ڈوبتی شام کا مڑتا ہوا سورج تم ہو  
سانولی صبح کا نکھرا ہوا منظر ہم لوگ

ہم سے ٹوٹے ہوئے لمحوں کی حکایات سنو  
زرد پتھراؤ میں پھرتے ہیں کھلے سر ہم لوگ

کھیت ورثے میں ملے ہیں ہمیں ایسے کم جہاں  
تیرگی کاٹتے ہیں روشنی بوکر ہم لوگ

ہم کو لے دے کے یہی ایک ہنس رہا ہے  
درد کے ناز اٹھالیتے ہیں ہنس کر ہم لوگ

کتنے مینخانے سلامت ہیں ہمارے دم سے  
گو بظاہر تو ہیں ٹوٹے ہوئے ساغر ہم لوگ

گھر کی دہلیز پر اُس شخص کی گردن ماری  
جس کو لے آئے تھے مقتل سے بچا کر ہم لوگ

ہم میں صدیوں کی کڑی دھوپ کی حدت ہے نوید!  
پیس اتنی ہے کہ پی جائیں سمندر ہم لوگ



احساس دیکھ پائے وہ منظر تلاش کر  
آنکھیں جو ہیں تو بوئے گل تر تلاش کر

تیرا بدن تو ٹوٹ گیا وصل ہی کی شب  
اب آئیے میں خود کو نہ دن بھر تلاش کر

ہر دل سے مانگتا ہے جو تازہ لہو کی بھیک  
بستی میں کوئی ایسا گدا گر تلاش کر

میرا وجود جذب ہوا تیرے جسم میں  
اب مجھ کو اپنے جسم کے اندر تلاش کر

تنہا یوں کے گہرے سمندر میں ڈوب جا  
زخموں کے پھول، درد کے گوہر تلاش کر

میں تھک گیا ہوں خاک بیاباں کی چھان کر  
موج نسیم! تو ہی مرا گھر تلاش کر

دشتِ وفا میں یوں نہ بھٹک در بہ در نوید  
سربن گیا ہے بوجھ تو پتھر تلاش کر



دن کا قاتل ہوں میں سُولی پہ چڑھا دو مجھ کو  
رات کے گہرے سمندر میں بہا دو مجھ کو

کھڑکیاں ہنستی ہوں، دروازے کھلا کرتے ہوں  
شہر میں ایک تو گھر ایسا دکھا دو مجھ کو

کب سے تنہائی کا آئینہ لئے پھرتا ہوں  
سنگ اندازوں کی بستی کا پتہ دو مجھ کو

لمحہ لمحہ مجھے سُولی پہ چڑھاتے کیوں ہو  
اک شکستہ سی تو دریا رہوں، ڈھکا دو مجھ کو

میں کوئی برف نہیں ہوں کہ پگھل جاؤں گا  
لمس کی آگ میں جب چاہے جلا دو مجھ کو

دُور کہساروں پہ جب شام اُتر آئے تو یہ  
کھول دو بابِ قفس اور اُڑا دو مجھ کو



آنکھوں میں زرد خواب کا جب تک ابو رہے  
بے حاصلی کا کرب ہی زیبِ گلہ رہے

تنہائیوں میں خود سے اُلجھنے کی خور رہے  
کوئی نہ ہو تو اپنا ہی سایہ عروس رہے

صحرا کی دھوپ ہم میں رواں ہے تو کیا ہوا  
شہروں میں ہم ہی آئینہٴ رنگِ دبو رہے

تہذیبِ میکدے کی دھواں ہو گئی نوید  
مینوار ہی رہے نہ وہ جامِ وسبو رہے



سناٹوں کے لب صدیوں سے چوم رہا ہوں  
آوازوں کے شہر! ترا مفہوم رہا ہوں

دل کی بینائی سے کیا محروم رہا ہوں  
آنکھ میں مُردہ سورج لے کر گھوم رہا ہوں

برسوں پہلے مجھ سے میرا قتل ہوا ہے  
خود سے آنکھ بچا کر اب تک گھوم رہا ہوں

تو ابوں کے بلے میں دب کر ٹوٹ گیا ہوں  
ورنہ میں تو برسوں شہرِ روم\* رہا ہوں

کوئی کو لمبس مجھ کو بھی دریافت کرے گا  
اک نشانِ جزیرہ، نامعلوم رہا ہوں

مجھ میں کتنی ہی راتیں کروٹ لیتی ہیں  
اور میں "سورج گھر" ہی سے موسوم رہا ہوں

مجھ میں نوید اب اور بھلا کیا خاک بچا ہے  
آنکھوں میں اک افسانہ منظوم رہا ہوں





اونچی غماتوں میں اُجالا تھا بلب کا  
فٹ پاتھ چاندنی کا بدن چومتا رہا

میرے قریب رہ کے بھی وہ مجھ سے دور تھا  
برسوں میں طے نہ ہو سکا لمحوں کا فاصلہ

تنہا جو آئیئے کے مقابل کبھی گئی  
میرا ہی چہرہ میرے لئے اجنبی لگا

جننے لگی ہے گمہ شب و روز درد کی  
دھندلا رہا ہے صبحِ تمنا کا آئیئے

راتوں کا کرب، دن کے سمندر میں جھونک کر  
سڑکوں کی بھیڑ بھاڑ میں وہ گھومتا رہا

شب ٹوٹنے لگی ہے سنہل جاؤ اب نوید  
سورج سمجھ نہ لے کہیں آنکھوں کا ماجرا



کچھ یوں ہوا وہ دُور کہ نزدیک آ گیا  
اُس کا وجود میرے بدن میں سما گیا

بادل سمندروں سے گلے ملنے کیا گیا  
صحرا کو تیز دھوپ کا آ سیب کھا گیا

اُس کے کھنچاؤ میں بھی لگا وٹ ہے کیا کریں  
وہ بے دفا سہی، پہ طبعیت کو بھا گیا

اُس کا خیال آتے ہی تنہائی مر گئی  
سناٹا آدمی کی طرح بولتا گیا

گہری، اندھیری رات کی دیوار پھاڑ کر  
سورج نہ جانے کب مرے کمرے میں آگیا

اُس کو تلاشنے کا جواز اب کہاں سے لائیں  
وہ جاتے جاتے نقشِ قدم بھی مٹا گیا

خود کو تراشنے کا ہنر سیکھئے کہ اب  
ہیرے تراشنے کا زمانہ چلا گیا

بُجھتے ہوئے چراغ کا ماتم نہیں نوید  
سورج کے شہر کو بھی اندھیرا بُجھا گیا



ایک آواز کہ جانی ہے نہ پہچانی ہے  
میری تنہائی اُس آواز کی دیوانی ہے

یہ الگ بات کہ چہرے پہ کہیں دھول نہیں  
خاک ہم نے بھی بیاہاں کی بہت چھانی ہے

شب کی دیوار سے ٹکرائے تو مرجائے گا  
دن کی دہلیز پہ سورج بڑا جولانی ہے

ایک منظر پہ ٹھہرتی ہی نہیں برسوں سے  
میری آنکھوں کی طبیعت بڑی سیلانی ہے

اس خرابے میں جہاں بھر کا سکون ملتا ہے  
دل کی دیرانی عجب طرح کی دیرانی ہے

خواب بے چہرہ لئے پھرتے ہو آنکھوں میں نوید  
دن نکلنے تو دو ، تعبیر کی عریانی ہے



کب ہم سے یوں ہی درد کا بارِ گراں اٹھا  
پہلے بدن میں آگ لگی پھر دھواں اٹھا

یہ کیا کہ پھر سے درد کا سیل رواں اٹھا  
بارش بہت ہے تیز کہ اب سائباں اٹھا

آنکھوں میں آفتاب کی بینائی گھول دے  
پلکوں پہ ماہتاب کی پرچھائیاں اٹھا

لفظوں کے پُل سے کچھ تو معانی کا ہو گزر  
یہ ربط فکر کا نہ کوئی آسماں اٹھا

آنکھوں سے دُور دتے ہی خوابوں کی کہکشاں  
گرہ دو غبارِ شب، پس دیوارِ جاں اٹھا

قربت سے اور فاصلے بڑھتے ہیں اے نوید  
دیوارِ دُوریوں کی، کوئی درمیاں اٹھا



کبھی کبھی تو کچھ ایسا دکھائی دیتا ہے  
ہنسوں تو آئینہ روتا دکھائی دیتا ہے

وہ دُور سے تو مجھے آدمی ہی لگتا ہے  
قریب جاؤں تو سایہ دکھائی دیتا ہے

روپہی شام پہاڑی پہ جب اُترتی ہے  
مرا وجود پرندہ دکھائی دیتا ہے

فرازِ دار سے لے کر حصارِ مقتل تک  
بس ایک شخص کا چہرہ دکھائی دیتا ہے

تُو کیا گیا کہ ترا عکس کو بہ کو پھپھلا  
ہر ایک آدمی تجھ سا دکھائی دیتا ہے

بدن میں کتنے ہی سورج اُتر چکے ہیں نوید  
رگوں میں پھر بھی اندھیرا دکھائی دیتا ہے

## نذرِ مخدوم

میرا "نیں" مجھ سے خفا ہو کے ملا آخر شب  
اور اونچی ہوئی دیوارِ انا آخر شب

آنکھ لگتے ہی چھٹا کا سا ہوا آخر شب  
آبگینوں کا بدن ٹوٹ گیا آخر شب

ہاتھ تو ہاتھ تھے، ہونٹوں کو بھی جنبش نہ ہوئی  
صرف آنکھیں رہیں مصروفِ دعا آخر شب

تیرا چہرہ میرے چہرے سے ابھر آیا تھا  
خود کو دیکھا تو اپنہا سا ہوا آخر شب

اک سجیلا سا، دمکتا ہوا بانکا چہرہ  
مطلعِ دل سے نمودار ہوا آخر شب

اک شکستہ، منضمحل دیوار کے سائے میں ہوں  
آج اگر ہے چھاؤں میں تو کل میرا سر دھوپ میں

ہڈیوں میں سنسناتے ہی رہے، کمرنوں کے تئیر  
پھر بھی چپ لیٹا رہا بوڑھا گداگر دھوپ میں

ریت کا کیا، ریت تو لعل و زمرد بن گئی  
کردٹیں لیٹا رہا بوڑھا سمندر دھوپ میں

لمحہ لمحہ جسم کے اندر پگھلتا ہوں نوید  
گو بظاہر میں پڑا ہوں بن کے پتھر دھوپ میں





تری گرفتار میں آئے نہ خود کے بس میں رہے  
ہم البہ بن کے ہواؤں کی دسترس میں رہے

وہ کون لوگ تھے صحرا میں جن کو پھول ملے  
چمن میں رہ کے بھی ہم لوگ خار و خش میں رہے

ہماری سادہ مزاجی ہی ہم کو لے ڈوبی  
ہم آسمان تھے لیکن زمیں کے بس میں رہے

وہ قافلے جو کہیں دشتِ شب میں دفن ہوئے  
سحر ہوئی بھی تو آوازہ جبرس میں رہے

بُچھے تو کیسے بُچھے پیاسِ حیم و جاں کی نوید  
کہ چند گھونٹ ہی پیمانہ ہوس میں رہے



جب دل میں تیری یاد کا غم مسکرائے ہے  
آنکھوں کے روزنوں میں دھنک پھیل جائے ہے

سورج کی آنکھ کھلتے ہی، کھڑکی کی راہ سے  
کمرے میں تازہ پھول کوئی پھینک جائے ہے

صدیاں ہوا کی طرح گزر جائے ہیں کہیں  
لمحہ پہاڑ بن کے کہیں ٹھیر جائے ہے

یہ تیرا جسم ہے کہ ہے جھونکا بہار کا  
تو جس گلی سے جائے ہے خوشبو اڑائے ہے

کیا نام ہے، کیوں آئے ہے پوچھا نہیں کبھی  
اک سایہ آدھی رات کو آکر جگائے ہے

دل ٹوٹتا ہے کب کسے معلوم لے نوید  
آنکھ ٹوٹ جائے تو آواز آئے سے



نہ طرزِ دوست، نہ رنگِ عدو سے ملتا ہے  
وہ بانگین جو تری گفتگو سے ملتا ہے

میں کیا بتاؤں یہ کس غورِ برو سے ملتا ہے  
جب آفتاب، لبِ آبجو سے ملتا ہے

زباں کی چاشنی ہم سے ہی پوچھئے صاحب  
کبھی کا سلسلہ جا کر کبھو سے ملتا ہے

ہمارے زخم ہرے ہوں تو مسکراتے ہیں  
ہمیں سکون بھلا کب رفو سے ملتا ہے

ہماری طرح یہ ہے کشتہ ستم کہ نوید !  
حنا کا رنگ ہمارے لہو سے ملتا ہے



برسوں تری آواز کے لب چوم چکا ہے  
سناٹا بھی اب کانوں میں رس گھول رہا ہے

کیلوں کی چٹک سن کے یہ محسوس ہوا ہے  
لبجہ ہے اُسی شخص کا آواز جدا ہے

تنہائی میں اکثر یہی محسوس ہوا ہے  
جیسے تو مرے جسم کے اندر ہی کھڑا ہے

سنّاٹے کو احساس کی آنکھوں سے تو دیکھو  
سنّاٹا بھی آواز کا نقشِ کفِ پا ہے

یہ شہرِ تمنا بھی عجب شہر ہے لوگو!  
دیکھو تو کڑی دھوپ ہے، سوچو تو صبا ہے

خوشید کو کل ہم نے جہاں دفن کیا تھا  
سُنّتے ہیں کہ خوشبو کا دہاں شہر اُگا ہے

ٹوٹے ہوئے لمحوں کا بدن کیسے چھپائیں  
ہر موڑ پہ حالات کا آئینہ جڑا ہے



اک زمانے تک تو بس ایسا ہوا  
جس طرف وہ تھا اُدھر چہرہ ہوا

ایک پل کی بازیابی کے لئے  
فاصلہ طے ہم سے برسوں کا ہوا

ہر کوئی رکتا ہے مجھ کو دیکھ کر  
میں بھی تیرے گھر کا دروازہ ہوا

تو ریلے زم زمیوں کا آسمان  
اور میں جنگل کا سناٹا ہوا

دل مگر برسوں لہو روتا رہا  
غم تو رخصت ہو گیا ہنستا ہوا

گھر میں، جانے کس لئے کھرام تھا  
ایک خط تھا میز پر رکھا ہوا

تجھ سے میری آشنائی بس یہی  
تو مسافر ہے تو میں رستہ ہوا

آئینہ در آئینہ صورت وہی  
اپنا چہرہ دیکھ کر عرصہ ہوا

خواب آنکھوں سے پگھل کر بہہ گئے  
شہرِ دل اک رات میں صحرا ہوا

اس قدر بے چہرگی کا خوف ہے  
آئینہ دیکھے ہوئے عرصہ ہوا

اُس سے بچ کر اب کہاں جائیں توید  
وہ تو ہے ہر موڑ پر ٹھیرا ہوا



جواں لمس کا ذائقہ بن گیا تھا  
وہ لمحہ ترا نقشِ پا بن گیا تھا

سہرِ شام، سورج ہڑپ کر رہا تھا  
آفاقِ سُرخ گوں اثر دہا بن گیا تھا

ہر اک شخص اوڑھا ہوا تھا تکلف  
ترا شہر بہرِ دِیا بن گیا تھا

لبوں پر تبستم بکھرنے سے پہلے  
ترے درد کا قہقہہ بن گیا تھا

میں جنگل کی بو جھل ہوا میں مقید  
وہ خوشبوئے دستِ صبا بن گیا تھا

کہاں تک میں آئیۓ نہ دل بچاتا  
سراپا وہ سنگِ جفا بن گیا تھا





جب بھی آدھی رات کو ہم گھر گئے  
چاندنی کا جسم میلا کر گئے

پتھروں کی پیخ سُن کر ڈر گئے  
یک بہ یک بوڑھے سمندر مر گئے

دل میں مُردہ سوجوں کی راکھ تھی  
رات جب ہم جسم کے اندر گئے

چاہتوں کے سر پھرے پتھراؤ میں  
ہم نہ جانے کیوں، برہنہ سر گئے

نیلَم ویا قوت آنکھیں بن گئیں  
جب تمناؤں کے ساغر بھر گئے

آسماں قدموں کے نیچے تھا نویدِ!  
اُڑ کے ہم خوابوں کی دھرتی پر گئے



فن ہے نازک بہت بُت گری کی طرح  
تیشہٴ فکر پیاسی ندی کی طرح

رات ڈھلتے ہی، لفظوں کی پاکیزگی  
کیوں اُترتی ہے ہم پر وحی کی طرح

آدمی کے لبِ ادے میں سورج ہے وہ  
میری آنکھیں ہیں سورج مکھی کی طرح

میرے چہرے کی افسردگی پر نہ جبا  
تیری آنکھوں میں کیا ہے نمی کی طرح؟

زخم انگڑائی لے کر چٹکنے لگے  
تیرے لہجے کی دوشیزگی کی طرح

چھوڑ جاتی ہے آنکھوں میں خوابوں کی ریت  
یاد اس کی ہے بہتی ندی طرح



خمار شب کا سحر دم رہا ہے آنکھوں میں  
تمہاری زلف کا ہر خم رہا ہے آنکھوں میں

وہ دن بھی آئے گا آنکھوں سے زخم ٹپکیں گے  
ابھی تو صرف لہو جم رہا ہے آنکھوں میں

کوئی بھی رت ہو بہکتا ہے صرف ساون ہی  
یہ کس کا دیدہ پُر خم رہا ہے آنکھوں میں

سُگلے شہر، اُجڑتے مکاں، جھلستے بدن  
کٹافتوں کا دھواں جم رہا ہے آنکھوں میں

نویۂ خواب اُگاؤ نہ ان حبزیروں میں  
کہ دھوپ چھاؤں کا عالم رہا ہے آنکھوں میں



غم میں لذت ہے نہ زخموں میں ہنسی باقی ہے  
نبضِ دل مثلِ چراغِ سحری باقی ہے

دل کا کشتل تو زخموں سے بھرا ہے لیکن  
تیرے دیوانوں کی دریوزہ گری باقی ہے

اب بھی آنکھوں کے جزیروں میں اُترتے ہیں کنول  
اب بھی ہونٹوں پہ تراشیدہ ہنسی باقی ہے

مری رگ رگ کا لہو چوس چکی ہیں، پھر بھی  
تری یادوں کی وہی تشنہ لبی باقی ہے

جانے کیوں جسم کا نیلام سلامت ہے نوید  
حسنِ یوسف، نہ زلیخا نظری باقی ہے



ہاں یہ بھی سچ نہیں کہ اداکار ہم نہیں  
جھوٹی انا کے آئینہ بردار ہم نہیں

کیوں دیکھتے ہو چشمِ تحیر سے بار بار  
لوگو! ابھی تو نقش بہ دیوار ہم نہیں

صدیوں سے ڈھونڈتے ہیں جو اپنے وجود کو  
کچھ اور سر پھرے بھی ہیں، دو چار ہم نہیں

بکھری ہیں آب و گل میں ہماری نشانیاں  
ڈھونڈو ہمیں یہیں کہ اُفق پار ہم نہیں

صبحِ ازل سے شامِ ابد تک ہیں ہم ہی ہم  
کس نے کہا کہ وقت کی رفتار ہم نہیں

لکھے گئے ہیں ایک انوکھی زبان میں  
تم جس کو پڑھ سکو گے وہ اخبار ہم نہیں

وہ کون سے ستم تھے جو ہم پر نہ ہو سکے  
کس کربِ ناتمام سے دوچار ہم نہیں

تیری زمیں کا بوجھ سلیقے سے بانٹ لیں  
اے آسمان! اتنے بھی مختار ہم نہیں

لہروں پہ چل رہے ہیں مثالِ ہوا نوید  
بوڑھے سمندروں کے لئے بار ہم نہیں



چوٹ لگنے پہ بھی ہنسنے کی ادا کیسی ہے  
درد کے شہر میں تہذیبِ وفا کیسی ہے

ہم نے آندھی میں چراغوں کو جلا رکھا ہے  
ہم سے پوچھو کہ زمانے کی ہوا کیسی ہے

ہر قدم پر تری آہٹ کا گماں ہوتا ہے  
تجھ کو پا کر تجھے کھونے کی سزا کیسی ہے

کاش! ہم درد کے مارے بھی کبھی سُن پاتے  
زندگانی! تیرے قدموں کی صدا کیسی ہے

راستے چُپ ہیں، دروِ بام پہ سناٹا ہے  
جانے اس شہر کی اب آب و ہوا کیسی ہے

تیرے کاندھے پہ ترا خود ہی جنازہ تھا نوید  
تو ہی اس خواب کی تعبیر بتا کیسی ہے





یہ کیسی فصل آنکھ میں بونے لگے ہیں ہم  
تجھ کو لگی ہے چوٹ تو رونے لگے ہیں ہم

جب چاہا توڑ موڑ دیا اپنے آپ کو  
تیرے بغیر خود کو کھلونے لگے ہیں ہم

تجھ سے بچپن کے یوں ہے زمانے کی ہر خوشی  
جیسے گلاب ریت میں بونے لگے ہیں ہم

اک تیری سمت دیکھ کے دیکھا جو آئینہ  
تجھ سے حسین تجھ سے سلونے لگے ہیں ہم

اک بوجھ ہے کہ دل پہ مسلسل دھرا ہوا  
اک زخم ہے کہ روح میں بونے لگے ہیں ہم

طوفاں سے پناہ کے آئے مگر جانے کیوں نوید  
ساحل کے پاس ناؤ ڈبونے لگے ہیں ہم



کیا جائے کب آخر شب آئینے ٹوٹے  
جب نیند میں تھا شہرِ حَلَب آئینے ٹوٹے

اُس رات میں اندر سے بہت ٹوٹ چکا تھا  
جس رات تری یاد کے سب آئینے ٹوٹے

وہ شخص تو پتھر کے مکانوں کا میں تھا  
اُس شخص سے کیا پوچھتے کب آئینے ٹوٹے

خورشید کو نیزوں پہ اُچھالا گیا جیسے  
سڑکوں کا بدن سُرخ تھا جب آئینے ٹوٹے

ایک شخص کے ادنیٰ سے اشارے کی بدولت  
جب رنگ پہ تھی بزمِ طرب آئینے ٹوٹے

فریاد نے تو ماہر تھے فنِ شیشہ گری میں  
جب کھل گئے دیوانوں کے لب آئینے ٹوٹے



صحرا کی خشک ریت تھی، ہر سو بکھر گئے  
کچھ خواب شہر درد میں آتے ہی مر گئے

سیال آگ پی کے وہ جب اپنے گھر گئے  
آنکھوں کا رنگ دیکھ کے آئینے ڈر گئے

پتہ تو لے کر تھے کہ دھماکے سے ڈر گئے  
سارے طیور شاخ پہ یکلخت مر گئے

سیلاب جب پہاڑ کے سر سے گذر گیا  
تم دیکھنے کو شہر کے دیوار و در گئے؛

اندھی رفاقتوں کا ہوا جب بھی تذکرہ  
آنکھوں کے روزنوں میں شرارے سے بھر گئے

شب بھر تو تیری یاد کے سائے کے مٹھتے  
منہائیوں کے دشت میں وقتِ سحر گئے

جب بھی چپراغِ درد کی کو کا پنے لگی  
دانستہ تیری راہگزر سے گزر گئے

جس کو ہمارے سائے سے بھی بے رتھا تو یہ!  
اُس شخص کی تلاش میں ہم در بہ در گئے



یہ زمیں جب سے سوالی ہو گئی  
آسماں کی جیب خالی ہو گئی

خواہشوں کی دھجیاں اوڑھی ہوئی  
زندگی کسیر کی ڈالی ہو گئی

طیش میں کچھ اور بھی وہ آگیا  
میری خاموشی ہی گالی ہو گئی

زندگی کے خالِ دُخ کی چھوڑیے  
موت بھی اب دیکھی بھالی ہوگئی

تیرے ہلکے سے تبسم کی لکیر  
شام کے ہونٹوں کی لالی ہوگئی

میری تنہائی کا چہرہ دیکھ کر  
آئینے کی شکل کالی ہوگئی

ہر گھڑی خود سے اُلجھتے ہو نوید  
کیا انا اب آنکھ والی ہوگئی؟



نظم ہو یا کہ غزل، جب کبھی تازہ لکھیں  
نئے الفاظ تراشیں، نیا لہجہ لکھیں

رات آنکھوں میں اُترنے لگی لمحہ لمحہ  
جب بھی سوچا ہے کہ سورج کا سراپا لکھیں

ہم کو مقتل میں جو لے آئے ہیں، اُن سے کہنا  
قتل کے بعد سہی، جرم ہمارا لکھیں

جسم جا گئے تھے کہ عزیاں تھی ہوس آنکھوں میں  
سہر بازار جو دیکھا تھا، تماشا لکھیں

پیاس، آسیب، دھواں، دشت، پھین، سناٹا  
اور تنہائی کی دیوار پہ کیا کیا لکھیں!

ہم نو جدت کے بھی قائل ہیں مگر کیا کیجے  
ہم سے ممکن ہی نہیں دھوپ کو سایہ لکھیں

ریگز اروں ہی سے پیاس اپنی بھائی ہے نوید  
جی میں آتا ہے کہ اب دشت کو دریا لکھیں



متفرق اشعار

اب درد میں لذت ہے نہ زخموں میں جلن ہے  
احساس میں ناکردہ گناہوں کی تھکن ہے



دوڑے ہے اب لہو کی جگہ گرد جسم میں  
تو کیا ٹوٹتا ہے مرے زرد جسم میں



مرے وجود کی ظلمت وہیں پہ جذب ہوئی  
ترے بدن کا جہاں آفتاب دیکھا ہے

وہ اک گناہ جسے لوگ پیار کہتے ہیں  
اُسی گناہ میں ہم نے ثواب دیکھا ہے

ہر سمت سے پتھر اُڑ رہے، کب دیکھئے کیا ہو  
شیشے کے گھر وندوں میں ہیں سب دیکھئے کیا ہو

دیوانے تو بے وجہ بھی رو دیتے ہیں لیکن  
فرزانوں کے رونے کا سبب، دیکھئے کیا ہو

بے چہرہ بدن، سانپوں میں لپٹے ہوئے ہر سو  
آنکھوں میں ہے اک خواب عجب، دیکھئے کیا ہو



جس آنکھوں میں دھوپ نہ اترے، وہ آنکھیں کیا دیکھوں  
سب چہرے میرے جیسے ہیں، میں درپن کیا دیکھوں



دہسکی، بے پروا، دھواں، آرکسٹرا، سٹاٹے میں گم  
فرش یہ لیکن رنگ رہے تھے ننگے ننگے جسم

جب بھی تنہائی کی ناگن، ڈس لیتی ہے مجھ کو  
تیرا لہجہ بن جاتی ہے میرے دل کی دھڑکن

آنکھوں سے آنسو برسنا سب کو آتا ہو گا  
کم ہی لوگوں کو آتا ہے آنسو پینے کا فن

جیسے رات کے سناٹے میں مرگھٹ کی خاموشی  
برسوں سے آسیب زدہ ہے میرے من کا آنگن



جلتے ہوئے لمحات کا آئینہ دکھا کر  
ہم شہر کو شرمندہ صحرا نہ کریں گے

ہر شام پگھلتے ہوئے لمحوں کے افق پر  
خوابوں کے نئے چاند تراشا نہ کریں گے

چپکی ہوئی رہتی ہیں در و بام سے آنکھیں  
اک رات بھی سوئیں نہیں آرام سے آنکھیں

کیوں شہر کی گلیوں سے گزرتے ہیں دروانے  
کیا جھانکنے لگتی ہیں در و بام سے آنکھیں؟

جب تجھ کو مرے دل سے تعلق ہی نہیں تھا  
کیوں بھیک گئیں آج مرے نام سے آنکھیں



فریبِ حُسن سے آنکھیں ملا کر  
تمہارا خوبصورت ہو گئی ہے



آنے والے لمحوں کا حل ڈھونڈ رہا ہوں  
میں یہاں جنگل ہوں مادل ڈھونڈ رہا ہوں

جس طرف دیکھئے، ہیں تازہ لہو کے دھبے  
مجھ کو ہر شہر نظر آتا ہے مقتل کی طرح

تیری تنہائی کا یہ سرد جزیرہ ہی نوید  
تجھ کو اک روز نگل جائے گا دلدل کی طرح



جب بھی آتا ہے کوئی سامنے پتھر کی طرح  
دل کھنک اٹھتا ہے ٹوٹے ہوئے ساغر کی طرح



وہ دل، مسرتوں کے خزانے کو کیا کرے  
جس دل کو غم کے ناز اٹھانے کا فن ملے

دھواں بن کر فضا میں اڑ رہے ہیں  
ہمارے جسم مرغولے بنے ہیں

بدن میں رات گھلتی جا رہی ہے  
مگر ذہنوں میں سورج اُگ رہے ہیں



جس کو جی جان سے چاہا، وہ پرایا نکلا  
میں جسے جسم سمجھتا رہا، سایا نکلا



تم اپنا چہرہ کہاں چھوڑ آئے ہو آخر  
بدن سمیٹ کے لائے ہوئے ہو صحرائی



تمام رات چراغوں کی طرح جل جل کر  
سحر کے وقت دھواں ہو گئے ہیں کما کچے



تَظَاهِرُ

١٩٤٠ تا ١٩٤٩





ہر ایک شخص میں حرف حرف پڑھتا ہے  
کبھی کتاب تھے، اخبار بن گئے ہم لوگ!



## ندائے نور

ذہن کی دیمک زدہ، الماریوں سے  
 فلسفہ، حکمت، ثقافت  
 ارتقاء تہذیب کے  
 گزے، جیمے، نوچ پھینکو  
 فلسفہ دیوانگی ہے  
 ارتقاء — ایٹم کی جولانی  
 تمدن — بربریت کا چمکتا تیز خنجر!  
 خون پی پی کر بھی جو رہتا ہے پیاسا  
 غور سے خود میں نہ جھانکو  
 (تم برہمنہ کل بھی تھے)

وہ —————

جو صدیوں کی ردِ اِوڑھے ہوئے  
 آندھیوں میں سانس لیتا اک دیا ہے  
 اس کی نورانی تپش سے  
 روح کی بے نور آنکھیں جگمگاؤ  
 غار میں اُتری ہوئی

آیات

تم کو آج بھی  
 آواز دیتی ہیں

سُنو

نزدیک جاؤ

# گر جتے ابا بیل

اندھیرے کے اونچے پہاڑوں کے اُس پار  
 لیٹا ہوا ہے اُجالا سحر کا  
 کئی مضمحل سائے زنبیل تھامے  
 پہاڑوں پہ چڑھنے کی ناکام کوشش میں گم ہیں  
 کئی کو بہن تھک گئے ہیں —

گر جتے ہوئے سنباتے ابابیل  
 چونچوں میں بارود کی آگ تھامے  
 پہاڑوں کے سینے پہ منڈلا رہے ہیں  
 دھماکوں کی سرگوشیاں بڑھ رہی ہیں  
 دُھواں پھیلتا جا رہا ہے فضا میں  
 ابھی تو اُجالا  
 اندھیرے کے اُونچے پہاڑوں کے اُس پار لیٹا ہے  
 مگر —————  
 ایک ساعت گزر جانے دو !

# عکسِ خوں ناب

ڈوبتی ساعتوں کا سبھل آئینہ  
پھڑپھڑاتے پرندوں کو  
نغمے سنائے

تو شعلوں کی تحریر کا عکسِ خوں ناب  
آنکھوں کی گہرائیوں میں ٹٹو لو  
کہ فانوسِ بلے کے نیچے دبے ہیں  
دھماکوں کی کاواک بو تھیل فضا میں  
تمہاری جبلت کو سہلا رہی ہیں

اُفق کی سحر تاب پر چھائیوں کا بدن  
 ٹوٹ کر ریزہ ریزہ نہ ہو جائے  
 چاندنی کی جواں انگلیاں  
 کالے شاتون پہ لہرا رہی تھیں  
 تو تم سو رہے تھے —

اور اب —

آگ خورشید کی پھانکنا چاہتے ہو؟  
 نرخرے میں جو سیال زخمی صدا پھنس گئی ہے  
 اُسے تم اُنڈیلو  
 جہاں آسماں —

بانجھ، بوڑھی جٹاؤں کو جھما رہا ہے !

## زندگی؛

تیرگی کا کفن اُڑھ کر  
 سوکھے سینے پہ یادوں کے بھاری سلوں کو لٹے  
 غم کے صحرا کی تپتی ہوئی ریتا پر  
 درد کی آہنی، سخت زنجیر میں  
 ایک مدت سے جکڑی ہوئی ہے  
 مگر

آج تک اس کے بچھرے ہوئے ہونٹ پر  
 پیچ تک بھی نہیں !



## تثلیث کی پیاس

کل تک میں ٹوٹا بربط تھا

یا مضراب نہ پوچھو

کمرے کی مرئی دیواروں سے چپکے

بوڑھے لمحوں کے آئینوں میں مجھ کو ٹٹولو

اپنی آنکھیں شلیف پہ رکھ دو

میری زیر و بلب کی آنکھیں چہرے پر کچھ دیر لگا کر مجھ کو ٹٹولو

بوڑھا بہ گہ ہنستا پنگھٹ، اُڑتا آنکھ  
اس تشلیٹ نے

میرے اندر کے انسان کو پوس لیا ہے  
میں کل تک کیا تھا مت پوچھو  
آج مرا چہرہ کتبہ ہے  
تین بوسیدہ قبر

کہ جس میں سٹری ہوئی میری اپنی ہی  
لاش پڑی ہے !

# اکیسویں صدی

کنوارے خواب متفنائی ہوئی یا ہیں ہیں  
 سب کو اپنی جانب کھینچتے ہیں  
 آنے والی ساعتوں کو اپنی مٹھی میں جکڑنے  
 سارے سائے، دھوپ کی پیلی تمازت پی رہے ہیں  
 کہ سیوں، میزوں، کتابوں سے نکل کر  
 لفظ آڈیو ٹیپ میں آکھڑے ہیں  
 سارے آدرشوں کو وحشی فلسفوں نے قتل کر ڈالا  
 جہزیرے اڑ رہے ہیں

اب

سمندر دھنستے جاتے ہیں

زمینوں میں

## آئینوں کا سفر

آئینے شفاف ہوں تو عکس دھندلاتے نہیں  
 آئینوں کو گرد سے محفوظ رکھو  
 یہ کسی بھی زاویے سے وارہ کر سکتی ہے ان پر  
 تیرگی بلے کے نیچے دب چکی ہے  
 روشنی کی تازہ فصلیں اُگ رہی ہیں  
 گئے وہ دن کہ ہم بے بال و پیر تھے  
 اب اڑ کر آسماں تک جاسکیں گے  
 خواب

تعبیروں کی اُجلی رہنمائی پر گامزن ہیں  
 آئیے خود کو تراشیں

## تار سائی

اور جب میری آنکھیں کھلیں  
 وہ دھواں ہو گیا تھا  
 روشنی دور جنگل میں بہنے لگی تھی  
 میں اک نقطہ خطِ فاصل !  
 کوئی پرکار ایسا نہیں تھا  
 جو مجھ کو بلا دے کسی دائرے سے  
 عجب سنناہٹ تھی  
 تیزاب بہنے لگا تھا رگوں میں  
 کوئی دندناقی ہوئی ریل پل سے  
 گذر جائے جیسے !!

## نئے سورج کی انگریزی

افق کی کوکھ سے

پھر اک نیا سورج جنم لے گا

یہ دھرتی پھر نئی کرنوں کی

برکھا میں نہا ئے گی

نئے سینوں کے پھر ہم بیج بوئیں گے

نیا سونا اگے گا

پگھلاتی ساعتوں کا کیا بھر دے

افق کی سمت

نظریں اپنی دوڑانے سے پہلے

ہمیں خود اپنے اندر جھانکتا ہے !

دماغوں اور دلوں میں

جو اندھیرا پل رہا ہے

اُسے دم توڑتی شب کی سیہ دہلیز ہی میں

دفن کرنا ہے

نئے سورج کی انگڑائی سے پہلے

عہد کرنا ہے

کلیسا، مندر و مسجد کے پتھر

ہماری راہ میں حائل نہ ہوں گے

ہمارے خواب اب گھائل نہ ہوں گے ! !

”میں لمبی پیند لینا چاہتا ہوں“

(صدر مصر جمال عبدالناصر مرحوم کے آخری الفاظ)

سرفروشو!

تم محافظ ہو مقدس نور کے

جس کی یاقوتی شعاعیں

ان گنت اذہان کی اندھی گذرگا ہوں کو

روشن کر رہی ہیں

نور اُگلتی اس مقدس سرزمین پر

کوئی شیطانی قدم جھنے نہ پائے



رات کے مکروہ

زہریلے بدن پر

نزد سورج کی طرح چڑھتے رہو

اُو اُس دجال کی تابوت میں

آخری اک کیل ٹھوکیں

مری بیدار آنکھوں میں

کئی راتوں کی سُرخ تیرتی ہے

مجھے اب مت جگاؤ

”میں لمبی نیند لینا چاہتا ہوں“

## تپسری آنکھ کی بے بسی

اور پھریوں ہوا

دودھیا بلب کی روشنی میں نہایا ہوا سایہ آگے بڑھا  
تنگ و تاریک، گندی گلی کی طرف مڑ گیا

دور

گر جا کے گھٹنوں نے انگوٹائی لی

پارک کے رُوبرو  
 اک فلک بوس عمارت کی کھڑکی کھلی  
 دوسرا ایک سایہ مہکتا ہوا  
 رینگتا رینگتا  
 تنگ و تاریک، گندی گلی کی طرف بڑھ گیا  
 اور پھر  
 پہلے سائے میں ضم ہو گیا  
 بلب بے بس تھا بس دیکھتا رہ گیا !!

## تخلیق

ایک — پتھر —  
 پڑا تھا جو کل راہ میں  
 آج میں نے تراشا  
 تو بُت بن گیا !  
 راہ میں  
 ایسے کتنے ہی پتھر ملے  
 صرف پتھر تھے وہ  
 ایک بھی  
 بُت نہ تھا !

وہ غواص اب اک سمندر بن گیا ہے  
(نذر زور مرحوم)

وہ اک آفتابی طرہ دار چہرہ  
دکن کے اُفق کا وہ روشن ستارہ  
زبانِ دکن کا لہو بن گیا ہے  
صدا، صوت کی جستجو بن گیا ہے

وہ آنکھیں —

جو عرصہ ہوا بچھ گئی ہیں  
کتابوں کو بینائی تقسیم کر کے  
دُھواں ہو گئی ہیں

ورق در ورق اب وہ چہرہ فردزاں  
قلم در قلم اس کی رعنائیاں ہیں

وہ غواص تھا  
 موتیاں لارہا تھا  
 مگر آج خود اک سمندر بنا ہے !  
 صدف سانس لیتے ہیں جس کے بدن میں  
 روشنی بہہ رہی ہیں  
 روشنی —  
 تازہ فصلوں کی ماں ہے  
 روشنی آسماں ہے  
 یہ ایوان ، یہ الماریاں ، یہ کتاہیں  
 اُسی کے ہیں بیٹے  
 انہیں ذہن و دل کا لہو دو  
 یہ بیٹے سمندر بنیں گے  
 سیال منظر بنیں گے !!

## درد کی موت

ذہن و دل میں اک انوکھا درد مہکا

رات بھر

پھول زخموں کے کھلے کھلتے رہے

آنکھ سے شبِ نیم کے موتی صبح تک گرتے رہے

تنہائی کے رخسار پہ

میں نے سارے موتیوں سے اپنا دامن بھر لیا

دن نکلتے ہی

ہمیشہ کی طرح

آنکھ سوکھی اور دامن خشک تھا

ذہن و دل شاداب ہی شاداب تھے!

”مرا آئینہ ہے وہ آئینہ“

یہ آئینہ — جو میرے سامنے رکھا ہوا ہے  
 بڑا بے حس، بڑا ہی سنگ دل ہے  
 میں تنہا جب بھی کمرے میں  
 دھوپ سے کھیلتا، حلقے بناتا  
 تھکن کو تھپتھپاتا گم  
 جو انجانے میں اس کے روبرو جاتا ہوں  
 مجھ پر طغز کرتا ہے



اُڑ دیتا ہے چہرہ میری گردن سے مہکتا مسکراتا  
 لگا دیتا ہے پھر  
 دیمک زدہ، مرل سا چہرہ  
 دھنسی ہیں جس میں زیرو بلب کی بیمار آنکھیں  
 مجھے پھر چاٹنے لگتی ہے دیمک  
 یہ آئینہ مرے ہاتھوں سے کتنی بار چھوٹا ہے  
 مگر ثابت ہے پھر بھی  
 میں اب تنگ آچکا اس آئینہ سے  
 یہ سوچا ہے کہ اب  
 اس آئینے کو  
 کہیں ایسی جگہ پر چھوڑ آؤں  
 جہاں پر آئینے ہی آئینے ہوں

## سحر سراب ہے

اندھیری رات کے جنگل سے دُور

اس جانب

سحر کے زرد سمندر کی سمت مت جاؤ

سحر سراب ہے، دھوکا ہے، اک چھلاوہ ہے

سحر وہ دھوپ کا پھیلا ہوا سمندر ہے

کہ جس میں ڈولتی رہتی ہیں موجیں کہ نوں کی

سحر کی تہہ میں نہ جھانکو

سحر کی تہہ میں بھی لیٹا ہوا اندھیرا ہے

## انحطاط

اس قدر کیوں سرد ہو تم  
 دست و پا سے پھوٹتی ہے کیوں نمی  
 جسم ہے یا برف کی قاشیں پگھلتی ؟  
 کانچ کی دیوار میں آنکھیں ابھی سے دھنس گئیں ؟  
 ( بلب اتنی جلد مدھم پڑ گئے )  
 یہ کمر پر ہاتھ کیسا  
 سانس میں پھنکار کیوں ؟  
 تھک گئے — !  
 تم ابھی تو صرف پندرہ سیڑھیاں ہی چڑھ کے ہو  
 دُور ہے منزل بہت !

# ”اُک نیا سُورج اُگے گا“

آہنی محبس کی زہریلی فضا میں  
زندگی کتنی بڑھ تھی

موت کی باہوں میں باہیں ڈال کر  
کس بانگین سے گامزن تھی  
(جیسے محبوبہ سے محو گفتگو ہو)

اُس جیالی زندگی کو آج سُولی پر چڑھا کر مُطمئن ہو

روشنی کی آڑ لے کر  
 عدل کا دم بھرنے والے  
 یاد رکھ !  
 ایک بے پایاں سمندر  
 دھوپ کی تلوار سے مرتا نہیں  
 تو کہ ہے جلتے ہو منظر کا خالق  
 تیری رگ رگ میں بھری چنگاریاں تھیں  
 آج شعلہ بن کے ظاہر ہو گئی ہیں

آج جو آواز مٹی میں دبی ہے  
 کل یہی آواز  
 لاوا بن کے بہہ نکلے گی  
 سڑکوں ، شاہراہوں  
 اور گلی کوچوں کے سینوں پر  
 لہو مشعل بنے گا  
 راک نیا سورج اُگے گا ! !

# ”صدف تمام ریت ریت“

آسمان —

ہم سے کیا خفا ہوا  
سمندروں کا خون خشک ہو گیا  
نڈی کی دوڑتی رگوں میں  
گرم ریت جم گئی

پہاڑ پیٹتے ہیں سر  
 کہ اُن کے کھردرے، گٹھیلے جسم پر  
 وہ شبہنی دھویں کا ساٹباں نہیں  
 کو نیلوں کے جسم زرد  
 کلی کلی کے لب : دعاۓ بے نوا  
 پھول پھول : خالی کا سہ گدا  
 ڈالی ڈالی : اک صلیب بن گئی  
 ہر اک دریچہ جاں بہ لب  
 ہر ایک چہرہ اک سوالیہ نشان گیا  
 ہر اک منڈیر پر اُداسیوں کی کاٹی جم گئی

خود اپنا خون پیتے پیتے  
 ہڈیاں چباتے اپنے جسم کی  
 جنگلوں سے شہر کی طرف یہ کون آگئے ؟  
 ہم گناہگار کیا ہوئے  
 ان کو اپنے اُن کیے گناہ کی سزا ملی

ہاتھ اب اٹھا رہے ہو ؟

وہ

ڈولتی حسین رتھ

جس پہ میگھ دیو سوار تھا

کٹا فتوں کی کالی دھوپ دیکھ کر

اُفق میں جذب ہو گئی

ہوا کے دوش پر ہے اب

خلاء کی لاش بے کفن !

وہ ابر نیساں اب کہاں

صدف تمام ریت ریت !!

اُداس اُداس کھیت کھیت !!



## بازگشت

علی الدین نوید، نئی نسل کے ان شاعروں میں ہیں جو اپنے لہجہ اور آواز سے پہچانے جاتے ہیں۔ لہجہ کی ہستواری اس بات کا پتہ دیتی ہے کہ فن کار کی شخصیت ایک خاص سانچے میں منضبط ہو چکی ہے۔ اسے وہ زاویہ نظر مل چکا ہے جس کی مدد سے وہ ارد گرد کے ماحول، سماج اور حیات اور کائنات سے اپنا رشتہ دریافت کرتا ہے اور پھر اپنے فکر و احساس کی ایک نئی دنیا تشکیل دے سکتا ہے۔ علی الدین نوید کی یہ دنیا اس فطری زندگی سے عبارت ہے جب انسان جنگل سے نکل آیا تھا لیکن جنگل سے اس کا رشتہ منقطع نہیں ہوا تھا۔

بھائی چارگی کے احساس کے ساتھ جو ابتدائی معاشرہ تشکیل پایا تھا اس نے چند بنیادی اخلاقی قدروں کو جنم دیا تھا۔ پھر مختلف اقطاع اور ادوار میں پیغمبروں، رشیوں اور مینیوں نے جہاں انسان کی جنگل میں بازگشت کو مدد دی وہیں تہذیب کے مادہ اور روحانی قدروں میں توازن پیدا کرنے کی کوشش کی۔ عہدِ حاضر میں یہ توازن بگڑ کر رہ گیا ہے۔ تہذیب کے نام پر شہروں میں جنگل اگ آئے ہیں اور جہانم نے انسان کا روپ دھار لیا ہے۔ جدید تہذیب کی بربریت نے ہر چیز کو مسخ اور آلودہ کر دیا ہے۔

وہ

ڈولتی حسین رتھ  
جس پہ میگھ دیو سوار تھا  
کٹافتوں کی کالی دھوپ دیکھ کر  
آفتی میں جذب ہو گئی  
ہوا کے دوش پر ہے اب  
خلا کی لاشی بے کفن  
وہ ابر نیساں اب کہاں  
صدف تمام ریت ریت  
اُداس اُداس کھیت کھیت  
اور پھر اکیسویں صدی کا یہ منظر :

کرسیوں، میزوں، کتابوں سے نکل کر  
لفظ آڈیٹوریم میں اُکھڑے ہیں  
سارے آدرشوں کو وحشی فلسفوں نے قتل کر ڈالا ہے  
جزیرے اڑ رہے ہیں  
سمندر دھنتے جاتے ہیں زمینوں میں

اگر یہ صورت حال مایوس کن ہوتی تو محزن اور اُداسی کی کیفیت شاعر کے  
لہجہ میں نرمی اور گد اُختگی پیدا کر دیتی۔ اس کے برخلاف علی الدین نوید کی شاعری میں  
جو آواز سنائی دیتی ہے اس میں کربِ ناکامی کے ساتھ احتجاج کی تلخی شامل ہے۔  
اور کہیں یہ آواز ایک چیخ بن جاتی ہے تو اس کا سبب یہ ہے کہ انسان اور انسانی  
قدروں سے شاعر کا اعتماد پوری طرح متزلزل نہیں ہوا ہے۔ اس کو شکایت زندگی  
سے ہے جو :

غم کے صحرا کی تپتی ہوئی ریت پر  
درد کی آہنی سخت زنجیر میں

ایک مدت سے جکڑی ہوئی ہے  
مگر —

آج تک اس کے پھر سے ہوئے ہونٹ پر  
چرخ تک بھی نہیں

اس کے باوجود وہ انسان کے مستقبل سے مایوس نہیں ہے کیوں کہ اسے یقین ہے  
کہ —

افق کی کوکھ سے

پھر اک نیا سورج جنم لے گا  
یہ دھرتی پھر نئی کرنوں کی  
برکھا میں نہاے گی

نئے پتنوں کے پھر ہم زنج بویں گے

یہ نیا سورج اس دیئے کی کوکھ سے جنم لے گا جو ”صدیوں کی بردا اوڑھے ہوئے“  
آج بھی ”آندھیوں میں سانس لے رہا ہے“ یہ دیا ”غار میں اُتری ہوئی آیات“  
نے روشن کیا ہے جہاں سے آج بھی ”بداے نور“ ساری انسانیت کو اپنی طرف  
بلا رہی ہے۔

علی الدین نوید کی غزلیں فرہنگ شعرا اور طرز احساس کے اعتبار سے غزل کا  
وہ رنگ و آہنگ رکھتی ہیں جو ان دنوں ہندوستان کے چند نوجوان شعرا کے کلام میں  
محسوس ہوتا ہے۔ ان کا اکھڑا ہوا سا اہمہ مزاج کی ایسی سرکشی کو ظاہر کرتا ہے جو  
ناموافق حالات میں ”انا“ کے شدید طور پر مجروح ہو جانے کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔  
ان لکھ مندرجہ ذیل دو تین غزلوں کے ”تجزیاتی جائزے کی روشنی میں ان کے شاعرانہ  
مزاج اور لہجے کو سمجھا جاسکتا ہے۔ مثلاً ذیل کے مطلع والی غزل میں کسی قدر  
سادیت پسندانہ، حقیقت نگاری جھلکتی ہے۔ قتل و خون، دہشت اور بیماری کا  
غیر جذباتی اور معروضی بیان بجائے خود دہشت خیز ہوتا ہے۔ مطلع میں کسی قدر  
ہمدردانہ تا سفاک جھلکتا ہے لیکن طنز آمیز تلخی کے ساتھ۔

راتیں علیل، صبح کا چہرہ بچھا ہوا  
اس دور کا بدن ہے لہو تھوکتا ہوا  
دوسرے ہی شعر (جو حسن مطلع ہے)

وہ سامنے کھڑا تھا، مرے بہت بنا ہوا  
اس کا تمام جسم لگا بولتا ہوا

میں مجبورہ کے بدن کی تصویر (JUXTA POSITION) کی کیفیت پیدا ہو گئی ہے۔ ”خون تھوکتے ہوئے بدن“ کے بعد ہی ”بولتے ہوئے بدن“ کی طرف شاعر کا متوجہ ہو جانا ہماری اس تیز رو زندگی کے اس کمر بنک پہلو کو نمایاں کرتا ہے کہ ہم کسی ایک جذبے سے سیراب نہیں ہونے پاتے کہ ایک دوسری ہی طرح کا احساس ہمیں آلیتا ہے۔ متضاد کیفیات کی یلغار شدید اعصابی ہیجان میں مبتلا کر دیتی ہے یا پھر بے جسی کا شکار بنا دیتی ہے۔ موجودہ زندگی کی لایعنیت کے احساس کے ساتھ مایوسی اور بے زارگی کی فضا غزل کے مطلع سے مقطع تک پہنچ گئی ہے۔ اس غزل میں جو دو تین خالص عشقیہ اشعار ہیں وہ بھی اس فضا سے متاثر ہو گئے ہیں —  
بدن یا جسم اس غزل کا مرکزی استعارہ ہے۔

— اس دور کا بدن ہے لہو تھوکتا ہوا

— اس کا تمام جسم لگا بولتا ہوا

— اس کے بدن کی چیخ بڑی دلخراش تھی

— ہر جسم پیلی دھوپ میں تحلیل تھا مگر

ان کے علاوہ دیگر اشعار میں بھی جہاں جسم یا بدن کے الفاظ استعمال نہیں ہوئے ہیں توجہ کسی جسم ہی کی طرف منعطف ہوتی ہے۔ مثلاً ”سورج سامنے کھڑا ہوا تھا“ کہنے میں ایک جسم کا تصور ابھرتا ہے۔ زخم، دل، اور تنفس جیسے الفاظ بھی کسی جسم کی موجودگی کا احساس دلاتے ہیں۔ اس غزل کے دو شعر مجھے زیادہ اچھے لگے :

مُس کے بدن کی چیخ بڑی دلخراش تھی ؛ میرا وجود آج بھی ہے کانپتا ہوا

’بدن کی پکار‘ اور ’بدن کے بلا دے‘ میں جو جنسی اور رومانی پہلو ہے۔ وہ ’بدن کی چیخ‘ میں نہیں ہے۔ بدن کی چیخ ایک اُفتاد کو ظاہر کرتی ہے۔ یہ افتاد بدن کی روایتی تہذیب کا ملیا میٹ ہو جانا ہے جس کے گونا گوں اسباب ہو سکتے ہیں۔ نتیجتاً جنسی حظ کی جگہ ابک درشت کی کیفیت لے لیتی ہے۔ ”دل خراش چیخ“ شدید نا آسودگی کو بھی ظاہر کرتی ہے۔ اس احتمال کو بھی رد نہیں کیا جاسکتا کہ شعر کا واحد غائب اور اور واحد متکلم ایک ہی شخصیت ہیں۔

(۲) ہر جسم پیلی دھوپ میں تحلیل تھا مگر

سڑکوں پہ سایہ سایہ ملا رینگتا ہوا

اس شعر میں موجودہ عہد کی اس صورت حال کو بڑے فن کارانہ انداز میں پیش کیا گیا ہے کہ کس طرح فرد اپنی شناخت کھو چکا ہے۔ جسم اپنے خط و خال رکھتا اور سایہ بے صورت ہوتا ہے۔ فردیت کھونے کے بعد انسان اور حشرات الارض میں فرق باقی نہیں رہا۔ دو پیروں پر کھڑے ہونے کا ظاہری امتیاز بھی ختم ہو چکا ہے اور وہ سایہ بن کر سڑکوں پر رینگتا پھر رہا ہے۔ شعر کی دلکشی اس کی صناعت کی وجہ سے بڑھ گئی ہے۔ صنعت تضاد کا دوہرا استعمال قابل توجہ ہے۔ سایہ، دھوپ اور جسم دونوں نقیض ہے۔ تضاد کا استعمال نہ صرف شاعری بلکہ بول چال کی زبان میں بھی عام ہے۔ اس کی نفسیانی وجہ یہ ہے کہ کسی شے کے تصور کے ساتھ ہی اس کے نقیض کی طرف خیال جاتا ہے لیکن تضاد جب کسی اور صنعت سے ترکیب پایا جاتا ہے تو اس میں تضاد کا استعمال کنایہ کے ساتھ ہوا ہے۔

وہ سامنے کھڑا تھا مرے بُت بنا ہوا

اس کا تمام جسم لگا بولتا ہوا

محبوب کے لئے بُت کا استعارہ عام طور پر لایا جاتا رہا ہے لیکن یہاں بُت بنا بطور محاورہ آیا ہے اور اس کے جواب میں ”بولتا ہوا جسم“ متضاد کیفیت کا حامل ہے۔ بُت اور بولنے میں براہ راست تضاد نہیں ہے بلکہ بُت کے کنایہ کی تشریح پر تضاد واضح ہوتا ہے۔

ایک اور غزل : اپنے سائے ہی کا قد ناپ کے اکثر ہم لوگ

جان جاتے ہیں کہ ہیں کتنے قد آور ہم لوگ

اس غزل کا جمع متکلم ایسے گروہ کی نمائندگی کرتا ہے جس کی مجرد انا

احساس برتری کا شکار ہے۔ ذیل کے اشعار میں محرومیوں اور شکستوں کا داد طلب

بیان ”زخموں کی فخریہ نمائش بن گیا ہے۔ ان اشعار کا طرزِ اظہار البتہ نیا ہے

ہم سے ٹوٹے ہوئے لمحوں کی حکایات سنو

زرد پتھراؤ میں پھرتے ہیں کھلے سر ہم لوگ

کھیت ورثے میں ملے ہیں ہمیں ایسے کہ جہاں

تیرگی کاٹتے ہیں روشنی بو کر ہم لوگ

اس غزل کا یہ شعر سادیت پسندانہ طرزِ اظہار کے باوجود گہرے طنز کی وجہ

سے معنی خیز اور اثر انگیز بن گیا ہے۔

گھر کی دہلیز پہ اس شخص کی گردن ماری

جس کو لے آئے تھے مقتل سے بچا کر ہم لوگ

اس شعر میں ردیف ”ہم لوگ“ اتنی وسعت رکھتی ہے کہ اس کے مقابل کوئی

’تم‘ یا ’وہ‘ موجود نہیں ہے۔ مقتول شخص بھی، اگر اسے قتل نہ کیا جاتا تو قاتلوں ہی

میں شامل رہتا۔ محافظ اور ناجی کے قاتل بن جانے کی مثالیں، سیاسی اور سماجی

زندگی میں عام طور پہ ملتی ہیں لیکن یہاں جس تجربے کو پیش کیا گیا ہے وہ نفسیاتی طور

پر زیادہ پیچیدہ ہے۔ اس پیچیدگی کے قریب پہنچنے کے لئے تھوڑی دیر کے

لئے یہ فرض کر لیا جائے کہ مقتول اور قاتل دو جداگانہ شخصیتیں نہیں ہیں۔ ہم خود اپنے

محافظ ہیں اور ہم ہی اپنے قاتل ہیں۔ یوں بھی غور کیا جاسکتا ہے کہ جس شخص کی

گردن ماری گئی ہے وہ ہماری انا — ہمارا ضمیر یا ہماری پہچان تو نہیں ہے ؟

مندرجہ ذیل غزل کے مطلع میں پہلی دو غزلوں کی سی انانیت اور خود سری

نہیں ہے۔ جذبے کو خام حالت میں اُگل نہیں دیا گیا ہے۔ وہ فکر اور تجربے کی

بھٹی میں تپ کر نکھر گیا ہے۔ غزل کا مطلع ہے۔

احساس دیکھ پائے، وہ منظر تلاش کر  
آنکھیں جو ہیں تو بُوئے گل تر تلاش کر

بُوئے گل تر کو دیکھنے کی خواہش میں یہ تمت شامل ہے کہ غیر مدرک، مدرک بن جائے۔ ایک حس کے لئے جو شے مدرک ہوتی ہے دوسرے حواس کے لئے رازِ سرستہ بنی رہتی ہے۔ مکمل ادراک یا بصیرت کے لئے ضروری ہے کہ تمام حواس اجتماعی طور پر اس عمل میں شریک ہوں۔ مضموم کو مشہود میں بدلنے کی خواہش تجربے کی یکسانیت سے اُکتاہٹ اور تنوع کی تلاش کو ظاہر کرتی ہے۔ خوشبو کا محزون گل تر ہے لیکن گل تر سے جدا ہو کر وہ ایک غیر مشہود وجود بن جاتی ہے۔ مجرد صفات کو ذات سے جدا کرنا اور مجرد اقدار کا تصور انسان کے لئے ممکن نہیں ہے یہی وہ صورت حال ہے جو وصل کو فراق بنا دیتی ہے۔ یہی وہ ازلی تشنگی ہے جو اس شعر میں بُوئے گل تر کی تلاش بن گئی ہے۔

اس غزل کا ایک اور قابلِ توجہ شعر یہ ہے :

میں تھک گیا ہوں خاکِ بیاباں کی چھان کر

موجِ نسیم ! تو ہی مرا گھر تلاش کر

اُردو اور فارسی شاعری میں گھر اور بیاباں کے تلازموں کے استعمال کو ذہن میں رکھتے ہوئے اس شعر کو پڑھا جائے تو ہم اس کی ندرت اور اس کے حسن سے زیادہ معظوظ ہو سکیں گے۔ بیاباں بقول غالب ”خلیۃ مجنوں صحر اگر د“ ہے۔ عشقِ بیاباں اور گھر میں تفاوتِ مکانی کو ختم کر دیتا ہے۔ صرف فاصلہٴ احساس باقی رہ جاتا ہے اس فاصلے کو موجِ نسیم مٹا سکتی ہے۔ موجِ نسیم کا گھر کو تلاش کرنا کتنا یہ ہے اس بات کا کہ درد ہی بیاباں کو گھر میں مبدل کر سکتا ہے۔ اس غزل کے محمولہ اشعار میں جو فن کاری اور دلکشی ہے وہ جذبات کی بیجان کیفیت پر غالب آنے کے بعد ہی پیدا ہو پائی ہے۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ شاعرِ سادیت، خود آزاریت کے عریاں مظاہرے کی منزل سے آگے بڑھ چکا ہے۔ علی الدین نوید کی ان غزلوں میں روایتی استعاروں اور علامتوں کا استعمال بہت کم ہوا ہے۔

فکر و احساس کی لہریں، علی الدین نوید کی غزلیہ شاعری میں ایجا نو اور پیر کاری کی وجہ سے زیادہ دل آویز، پہلو دار اور معنی خیز بن کر ابھری ہیں اور ان کا اظہار بیش تر نور و ظلمت سے تعلق رکھنے والے استعاروں اور علامت کے ذریعے ہوا ہے ان کے علاوہ دشت، صحرا، سمندر، بادل، ریت، مقتل، صلیب، دیوار، پتھر، صدف، کھیت، سناٹا، آسیب، پیاس، سایہ، آئینہ، چہرہ وغیرہ جدید شاعری کے وہ علامت ہیں جنہیں نوید نے منفرد انداز میں اپنے اظہار کا ذریعہ بنایا ہے۔ نوید کی شاعری کا واحد متکلم اس نسل کا نمائندہ ہے جسے اپنی مجبوریوں اور محرومیوں کا شدید احساس ہے لیکن وہ یہ بھی جانتا ہے کہ ایک دن آستین کا لہو پیکار اُٹھے گا۔ اور اس کی مظلومیت رنگ لاکر رہے گی۔ جبر حالات سے قہر ذات تک محسوسات اور واردات کی ایک دنیا ہے جو نوید کی شاعری میں ہماری آپ کی زندگی کو آئینہ دکھاتی ہے۔ اس دنیا کی ایک جھلک ان اشعار میں دیکھی جاسکتی ہے۔

کتنی صدیوں سے، شکستہ مقبروں کے آس پاس  
شب کے سناٹے میں اکثر چیغتی ہے زندگی

بادل سمندروں سے گلے ملنے کیا گیا  
صحرا کو تیز دھوپ کا آسیب کھا گیا

چلے تو دشت دیباہاں کا قہر تھا ہم میں  
رُکے تو سایہ دیوار بن گئے ہم لوگ

تپتی ہوئی سانسوں کو خنک چھاؤں میں لے کر  
سورج کی تمازت میں جھلٹے رہے اشجار



قدم قدم پہ اندھروں کا ساٹنا ہے خویہ  
اگر ہے خوف ہوا کا تو پھر جلا نہ کر د

برسوں پہلے مجھ سے سیرا قتل ہوا ہے  
خود سے آنکھ بچا کر اب تک گھوم رہا ہوں

دن کا قاتل ہوں میں، سولی پہ چڑھا دو مجھ کو  
رات کے گہرے سمندر میں بہا دو مجھ کو

شب ٹوٹنے لگی ہے، سنبل جاؤ اب نوید  
سورج سمجھ نہ لے کہیں آنکھوں کا ماجرا

آنے والے لمحوں کا حل ڈھونڈ رہا ہوں  
میں پیاسا جنگل ہوں، بادل ڈھونڈ رہا ہوں

بے چہرہ بدن، سانپوں میں لپٹے ہوئے ہر سو  
آنکھوں میں ہے اک خواب عجیب دیکھے کیا ہو

دوڑے ہے اب لہو کی جگہ گمرد جسم میں  
تو کیا ٹوٹتا ہے مرے زرد جسم میں

ہم لوگ کڑی دھوپ کے شیدائی تھے ورنہ  
یوں سر کو چھپانے در دیوار بہت تھے

رُہ پہلی شام پہاڑی پہ جب اُترتی ہے  
مرا وجود پرندہ دکھائی دیتا ہے

سیلاب جب پہاڑ کے سر سے گزر گیا  
تم دیکھنے کو شہر کے دیوار دے کر گئے؟

یہ زمیں، جب سے سواری ہو گئی  
آسماں کی جیب خالی ہو گئی

ابتداء میں نوید کے اسلوب میں بیانیہ عنصر کسی قدر غالب تھا۔ جذبات کی یلغار کے لئے اظہار کی سہولت اس میں تھی کہ براہ راست خطاب سے کام لیا جائے۔ رفتہ رفتہ وہ ایمائی اور بالواسطہ اظہار کی طرف مائل ہوتے گئے۔ اب ان کے لہجے کی تلخی، بلند آہنگی اور قطعیت بھی کم ہو گئی ہے جس سے ان کے طرز احساس میں تبدیلی کا پتہ چلتا ہے۔ نوید کی شاعری میں زندگی کو مخصوص زاویے سے دیکھنے کے بجائے اس کو تمام حواس کے ساتھ برتنے اور خود اپنے من میں ڈب کر زندگی کا سراغ پانے کی جو لگن ہویدا ہوئی ہے وہ ان کے سفرِ فن میں ایک نئے اور — خوش آئند موڑ کی نشان دہی کرتی ہے۔

(ڈاکٹر مغنی تبسم)

(ریڈر شعبہ اُردو۔ جامعہ عثمانیہ)

نام :	محمد علی الدین
تلمی نام :	علی الدین نوید
تاریخ پیدائش :	۴ اربولائی ۱۹۶۴
مقام پیدائش :	ہمت آباد (حیدرآباد - کرناٹک)
سکونت :	351 - 3 - 16 چنچل گوڑہ - حیدرآباد
تعلیم :	بی۔ ایس سی - ایم - اے - پی - ایڈ
پیشہ :	تدریس